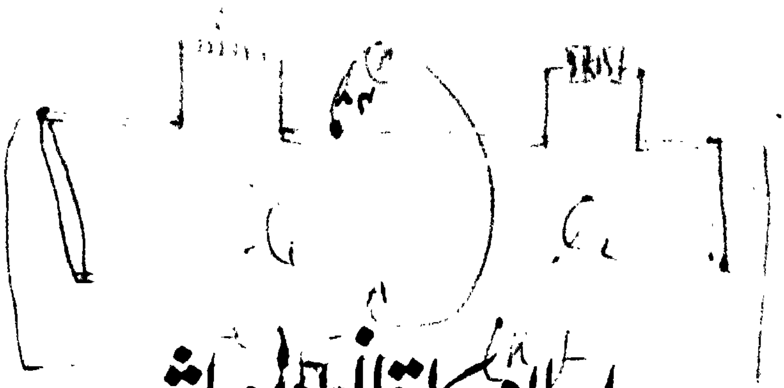

اسلام کا قانونِ وراثت

مولانا سید جلال الدین عمری

موجودہ دور میں اسلام کے جن سماجی اور معاشرتی مسائل پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ ان میں اس کا "قانونِ وراثت" بھی ہے۔ اسلام ایک خاص انداز سے خاندان کی تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے اس نے اپنا ایک تفصیلی نظام وضع کیا اور۔ قانونِ وراثت اسی کا ایک جزو ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے پہلے خاندان کی ساخت، افرادِ خاندان کے باہمی تعلقات کی نوعیت اور ان کی نفسیات کو سمجھنا ہوگا اس کے بغیر اسلام کے "قانونِ وراثت" کی معنویت سمجھ میں نہیں آسکتی۔

خاندان انسانی سماج کا سب سے قدیم اور بہت ہی اہم ادارہ ہے۔ اس کی شکلیں تو زمانہ اور حالات کے لحاظ سے بدلتی رہی ہیں۔ لیکن اس کا وجود ہمیشہ باقی رہا ہے خاندان سے انسان کی بعض بالکل ابتدائی اور بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ خاندان کا کوئی ایسا بدل آج تک وجود میں نہیں آیا جو ان ضرورتوں کو اس سے بہتر طریقہ سے پورا کرسکے۔ یہی وجہ ہے کہ خاندان سے انسان کی وابستگی بھی مسلسل جاری ہے۔ وہ ماضی میں بھی اس سے اپنا تعلق توڑ نہیں سکا۔ اور شاید مستقبل میں بھی اس سے بے نیاز نہیں ہو سکے گا۔

خاندان سے انسان کے تعلق کی وجہ محض یہی نہیں ہے کہ وہ اس کا محتاج ہے۔

بلکہ اس تعلق کی نوعیت جذباتی بھی ہے ۔ وہ اس کی ایک سماجی ضرورت بھی ہے ۔ اور اس کی فطرت کا تقاضا بھی ۔ انسان کو اپنے خاندان سے بے پناہ محبّت ہوتی ہے اور وہ اس سے غیر معمولی قُرب محسوس کرتا ہے ۔ غیروں کے درمیان اس کو اجنبیت کا جو احساس ہوتا ہے ۔ خاندان والوں میں پہونچ کر اس کا یہ احساس ختم ہوجاتا ہے ۔ ان کی موجودگی اس کی خوشی میں اضافہ کا سبب بنتی ہے اور ان کی جدائی اس کو دل گیر اور مغموم بنا دیتی ہے ۔ خاندان سے اس کو اتنی شدید وابستگی ہوتی ہے کہ اس سے اس کو بڑے سے بڑا صدمہ اور تکلیف بھی پہونچ جائے تو بالعموم اس سے وہ اپنا تعلق توڑنا پسند نہیں کرتا ۔

افرادِ خاندان کے درمیان ایک طرح کا "معاہدہ" ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے دُکھ درد میں کام آئیں گے اور ان کے معاون اور مددگار ہوں گے ۔ ان کے بڑے ان کے چھوٹوں کی پرورش اور دیکھ بھال کریں گے ۔ اور ان کے چھوٹے ان کے بڑوں کی تعظیم اور خدمت بجا لائیں گے ۔ خاندان کے نفع و نقصان کو اس کا ہر فرد اپنا نفع و نقصان سمجھے گا اور خاندان کو فائدہ پہنچانے اور اسے نقصان سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا ۔ یہ معاہدہ گو الفاظ کی شکل میں موجود نہیں ہوتا لیکن خاندان کا ہر فرد اس سے واقف ہوتا ہے ۔ اور اس کی پابندی کو ضروری سمجھتا ہے ۔ جب کبھی اس کی خلاف ورزی ہوتی ہے ۔ تو اس کو ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے ۔ اور اس پر تنقید کی جاتی ہے

خاندان سے اپنے فطری تعلق کی بنا پر انسان افرادِ خاندان کی خدمت کرتے ہوئے اور ان پر اپنی دولت صرف کرتے ہوئے ایک طرح کی خوشی محسوس کرتا ہے بلکہ بسا اوقات وہ اپنی ذات پر خاندان والوں کو ترجیح دیتا ہے ۔ اور ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھتا ہے ۔ اس کے پیچھے کوئی خارجی دباؤ نہیں ہوتا ۔ بلکہ خاندان سے تعلق اور اس سے محبّت اس کو اس پر مجبور کرتی ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کی معاشی

سماجی اور سیاسی جدو جہد کے پیچھے اس کا ذاتی مفاد پوری قوت کے ساتھ کارفرما ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے کہ اپنے خاندان کی ضروریات پوری کرے اس کے لئے غذا ، لباس ، مکان اور آسائش و آرام کا سامان فراہم کرے ۔ اسے سماجی لحاظ سے اوپر اٹھائے ۔ اور اس کو خوشحال اور ترقی یافتہ دیکھے ۔ یہ جذبہ نہ ہو تو اس کی دوڑ دھوپ کا ایک بڑا محرّک ختم ہو جائے گا ۔ اور اس کی کوششیں مدھم پڑجائیں گی ۔ حقیقت یہ ہے کہ خاندان کی فلاح و بہبود اس کی فلاح و بہبود ہوتی ہے ۔ وہ دونوں کو بالعموم ایک سمجھتا ہے ۔ اور ان میں بہت کم فرق کرتا ہے ۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ خاندان کے تمام افراد سے انسان کا یکساں تعلق نہیں ہوتا ۔ جو افراد اس سے فطری طور پر بہت ہی قریب ہوتے ہیں اور عملاً جن کا تعاون اس کو سب سے زیادہ حاصل ہوتا ہے ان سے اس کا تعلق بھی غیر معمولی ہوتا ہے اس کے برعکس جو افراد اس سے جس قدر دور ہوں اس کا تعلق بھی ان سے اتنا ہی کم ہوتا ہے ۔ اپنے اسی تعلق کی بنیاد پر وہ خاندان کے افراد کے ساتھ معاملہ کرتا ہے ۔ دور کے افراد کے مقابلہ میں قریب کے افراد سے اس کو محبّت بھی زیادہ ہوتی ہے ۔ اور وہ ان کے ساتھ ترجیحی سلوک بھی کرتا ہے ۔

انسان کے ان ہی فطری جذبات پر اسلام نے خاندانی نظام کی بنیاد رکھی ہے ، اس نے اہلِ خاندان کے ساتھ حسنِ سلوک کی بے حد تعریف کی ۔ اور اس کو ایک بڑی اخلاقی خوبی قرار دیا کہ انسان اپنے گھر والوں کے دُکھ درد میں کام آئے ۔ اور ان کی ضروریات پوری کرے ۔ جس شخص میں یہ وصف نہ ہو اور جو اپنے قریب ترین افراد کو بھول جائے ۔ اس کی شدید مذمّت کی ۔ اور اس کو سخت گناہ گار ٹھہرایا ۔

کسی بھی نظام کو وجود میں لانے کے لئے محض اخلاقی تعلیم کافی نہیں ہوتی ۔ بلکہ قانون کی قوّت بھی درکار ہوتی ہے ۔ تاکہ اس کی خلاف ورزی سے روکا جا سکے ۔

اس میں شک نہیں کہ خاندان کا تعاون انسان کی فطرت میں داخل ہے ۔ اور وہ قانون کی سختی کے بغیر بھی بالعموم اس پر عمل کرتا ہے لیکن اس کے باوجود بعض اوقات وہ اپنے اس فطری داعیہ پر عمل نہیں کر پاتا بلکہ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ اس کے خلاف بغاوت کر بیٹھتا ہے ۔ اسی وجہ سے اسلام نے ترغیب و تشویق ہی سے نہیں بلکہ قانون کے زور سے بھی انسان کو اس بات کا پابند بنایا کہ وہ اپنے خاندان والوں کا تعاون کرے ۔ اور ان کی ضروریات کی تکمیل کا بوجھ اٹھائے ۔ والدین اور اولاد کا تعلق اس کی ایک واضح مثال ہے ۔ یہ تعلق بالکل فطری ہے ۔ اور انسان بغیر کسی خارجی دباؤ کے اولاد کی پرورش اور خدمت اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہے لیکن کبھی کبھی وہ ان قریب ترین افراد کو نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اسلام نے اخلاقی ہدایات کے ساتھ قانون کے ذریعہ بھی والدین اور اولاد کے حقوق محفوظ کر دئے ہیں تاکہ نہ تو والدین کو اولاد نقصان پہنچا سکے اور نہ اولاد کو والدین کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے[1]

ٹھیک یہی نوعیت وراثت کی ہے ۔ وراثت انسان کی فطرت کا ایک بنیادی تقاضا ہے ۔ اسلام نے اس فطری تقاضے پر عمل کرنے یا نہ کرنے کی آزادی نہیں دی بلکہ اپنے ماننے والوں کو قانون کے ذریعہ اس کا پابند بنا دیا ۔ یہاں ہم پہلے یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ وراثت انسانی فطرت کا کوئی مطالبہ ہے یا نہیں ۔ پھر اس

---

[1] ۔ بعض لوگ اس بات کا انکار کر سکتے ہیں کہ خاندان انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے ۔ موجودہ مغربی سماج نے اس کا جواب دے دیا ہے ۔ مغرب کا انسان اپنی کج فکری اور غلط روی کے باعث خاندان کے شیرازہ کو منتشر کر کے جس طرح سکون اور چین سے محروم ہو چکا ہے ۔ اس کے بعد خاندان کی ضرورت سے انکار کرنا آسان نہیں ہے ۔

کے بعد وراثت سے متعلق اسلام کی تعلیمات کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

یہ ایک حقیقت ہے اور مشاہدہ اس کی تائید کرتا ہے کہ انسان اپنے کنبہ اور خاندان ہی کو اپنا جائز وارث تصور کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی میں جس طرح اپنے مال و دولت میں غیروں کا حق تسلیم نہیں کرتا اسی طرح وہ اس کو بھی صحیح نہیں سمجھتا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی دولت ان افراد کے ہاتھوں میں چلی جائے جن کو وہ اجنبی اور غیر تصور کرتا ہے۔ انسان کے اندر ملکیت کا بہت شدید احساس پایا جاتا ہے۔ اس احساس کو نہ تو نکالا جا سکا ہے۔ اور نہ کسی طرح نکالا جا سکتا ہے۔ یہ احساس تقاضا کرتا ہے کہ جو چیز اس کی ملکیت میں ہے اور جس دولت اور سرمایہ کو اس نے محنت اور مشقت سے حاصل کیا ہے اور جس کا وہ جائز حقدار ہے اس پر زندگی بھر اس کا قبضہ رہے۔ اور اس کے بعد یہ ان لوگوں کی طرف منتقل ہو جو زندگی میں سب سے زیادہ اُس سے قریب تھے اور جن کو وہ اپنا عزیز اور رشتہ دار تصور کرتا تھا اس کے بغیر اس کے احساسِ ملکیت کی تسکین نہیں ہوتی۔ اس تصوّر ہی سے اس کو سخت تکلیف پہنچتی ہے۔ کہ جن چیزوں کا آج وہ مالک ہے کل وہ غیروں کے قبضہ میں چلی جائیں گی۔

پھر یہ بھی انسان کی خواہش ہوتی ہے اور اس خواہش کو غلط بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اپنی زندگی میں وہ جن افراد سے قریب رہا اور جو اس کے قریب رہے، جن سے وہ محبت کرتا تھا اور جو اس سے محبت کرتے تھے جن کا معاشی بوجھ وہ اٹھائے ہوئے تھے۔ اور جو اس کی معاشی تگ و دو میں مدد کر رہے تھے، جن کے دُکھ درد کو وہ اپنا دکھ درد سمجھتا تھا اور جو اس کے دُکھ درد میں شریک تھے، اس کے مرنے کے بعد وہ دوسروں کے محتاج اور دست نگر نہ ہو جائیں اور اس کی دولت وسرمایہ ان کی آسائش و راحت پر اس طرح صرف ہو جس طرح اس کی زندگی میں صرف ہوتا رہا۔ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس نے ان کی ترقی اور کامیابی کے لئے جو کوششیں شروع کی ہیں وہ اس کے اس دُنیا سے اُٹھتے ہی ختم نہ ہو جائیں۔ اس کا کاروبار بند نہ ہو جائے۔ اس کے بچوں کی تعلیم کا سلسلہ منقطع نہ ہو جائے۔ ان کی ترقی کے امکانات مسدود نہ ہو جائیں

وراس نے ان کے لئے جس مکان کی تعمیر کا آغاز کیا ہے وہ ادھورا نہ رہ جائے ۔ اس لئے اس کی دولت کا بہترین مصرف یہ ہے کہ اس کے بعد بھی اس کے یہ کام جاری رہیں س سے اس کی ایک فطری خواہش کی تکمیل ہوگی ۔ اور وہ اس اطمینان کے ساتھ دنیا سے جائے گا کہ اس کی دولت اس کے جائز مستحقین ہی کے فلاح و بہبود پر صرف ہوگی ۔

انسان کے عزیزوں کی فلاح و بہبود کا کام کسی ادارہ کے ذریعہ بھی انجام دیا جا سکتا ہے لیکن اگر وہ خود اس کے لئے کسی کا انتخاب کرے ـــــ اور اسی کو فی الواقع اس کا حق ملنا بھی چاہیئے ـــــ تو وہ اپنے عزیز و اقارب ہی کا انتخاب کرے گا ۔ ان کے ہوتے ہوئے وہ کسی دوسرے شخص یا ادارہ کو جب تک کہ کوئی بڑی رکاوٹ نہ ہو، ترجیح نہیں دے سکتا ۔ اس کے کئی اسباب ہیں ۔ ایک وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے عزیزوں ہی کو اپنی دولت کا جائز حق دار سمجھتا ہے ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کو اپنے خویش و اقارب پر جو اعتماد ہوتا ہے وہ دوسروں پر نہیں ہوتا ۔ اس لئے وہ اپنی دولت کو ان کے حوالہ کرتے ہوئے اطمینان محسوس کرتا ہے ۔ تیسری وجہ خالص نفسیاتی ہے ۔ جو کام اس کے عزیزوں اور قرابت داروں کے ذریعہ انجام پائے ۔ اس کو وہ اپنا ہی کام تصور کرتا ہے ۔ لیکن اگر یہی کام دوسرے انجام دیں تو وہ اس کو اپنا کام نہیں سمجھتا ۔ بلکہ غیر متعلق لوگوں کا کام سمجھتا ہے ۔ اس کے ادھورے کاموں کو اس کی اولاد اور اس کے بھائی بند جاری رکھیں تو یہ اس کے نزدیک اس کے اپنے ہی کاموں کا تسلسل ہوتا ہے لیکن اگر یہی کام دوسرے افراد انجام دیں تو اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کے اپنے ہی کاموں کا تسلسل ٹوٹ گیا اور غیروں کے ہاتھوں میں چلا گیا ۔ وراثت کی بنیاد انسان کا یہی فطری احساس ہے ۔

وراثت کے تصور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کی نوعیت بالکل ایسی ہے۔ جیسے کسی کو راہ چلتے کوئی خزانہ ہاتھ آجائے ۔ یا لاٹری میں کوئی چیز مل جائے ۔ اس کا

تعلق آدمی کی محنت اور صلاحیت سے نہیں ہوتا بلکہ بخت و اتفاق سے ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک مالدار شخص کی اولاد لازماً مالدار ہوگی اور ایک غریب شخص کا بچہ غریب ہی ہوگا۔ حالانکہ غریب یا مال دار گھرانے میں پیدا ہونا محض ایک اتفاقی واقعہ ہے۔ کسی کا اختیاری عمل نہیں ہے۔

یہ اعتراض مختلف پہلوؤں سے صحیح نہیں ہے

(۱)۔ اگر وراثت محض اس لئے قابلِ اعتراض ہے کہ وہ بخت و اتفاق سے ملتی ہے تو فی نفسہ یہ بات بھی قابلِ اعتراض ہونی چاہئے۔ کہ کوئی بچہ دولت مند گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے بے شمار سہولتوں کا مستحق ہو جائے۔ اور ایک مفلس خاندان کا بچہ ان سب سے محروم رہے جب کہ کسی بچہ کا غریب یا امیر گھرانے میں پیدا ہونا محض اتفاق ہی ہے۔

(۲)۔ وراثت کے بارے میں یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ وہ بخت و اتفاق ہی سے حاصل ہونے والی دولت ہے۔ ایک شخص کی دولت میں بالعموم اس کے بیوی بچوں، ماں باپ اور اہلِ خانہ کی کوششوں اور تعاون کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہ تعاون کبھی روپیہ پیسہ، دوڑ دھوپ اور محنت کی شکل میں ہوتا ہے۔ اور کبھی محبت اور ہمدردی، ہمت افزائی اور غم گساری کی شکل میں ہوتا ہے۔ آدمی کو اپنے عزیزوں سے چاہے ٹھوس مادّی تعاون حاصل نہ بھی ہو لیکن یہ اخلاقی تعاون ضرور حاصل ہوتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت کم نہیں ہے بلکہ آدمی کی ترقی کے لئے یہ بہت ضروری ہے اس کے بغیر وہ آسانی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

(۳)۔ وراثت کا تعلق صرف مال و دولت ہی سے نہیں بلکہ اور بھی بہت سی چیزوں سے ہے۔ ہر بچّہ جو پیدا ہوتا ہے وہ اپنے ماں باپ اور خاندان والوں کی شکل و صورت، رنگ روپ اور قد و قامت بھی لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اور ان کی ذہانت

اور کند ذہنی، ان کے اخلاق و عادات، ان کی قوتیں اور صلاحیتیں، ان کی کمزوریاں اور خوبیاں بھی اپنے ساتھ لاتا ہے۔ جس طرح یہ ایک طبعی حقیقت ہے کہ ایک ذہین اور باصلاحیت آدمی کی اولاد ذہین اور باصلاحیت ہوتی ہے۔ تندرست و توانا آدمی کے بچے تندرست و توانا پیدا ہوتے ہیں۔ مریض اور کمزور ماں باپ کی اولاد کمزور اور بیمار ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ ایک سماجی حقیقت ہے کہ دولت مند آدمی کے گھر پیدا ہونے والا دولت مند اور غریب شخص کا بچہ غریب ہوتا ہے۔ اگر یہ چیز ناپسندیدہ ہے تو سب سے پہلے غربت اور امارت کو مٹا کر تمام انسانوں کے درمیان کامل مساوات پیدا کرنی ہوگی جو شاید عملاً ممکن نہیں ہے۔ ایک شخص وراثت میں ملنے والی بے شمار خوبیوں کے ساتھ میدان میں آتا ہے۔ اور غیر معمولی کارنامے انجام دے جاتا ہے۔ جب تک اس کے کسی اقدام سے دوسروں کو نقصان نہ پہنچے اسے نہ تو ظلم کہا جاتا ہے اور نہ اس پر پابندی لگائی جاتی ہے۔ اس لئے یہ بڑی زیادتی ہوگی کہ کسی امیر گھرانے میں پیدا ہونے والے بچے کو اس کے ماں باپ کی دولت سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہ دی جائے جبکہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔

(۴)۔ وراثت میں ملنے والی دولت یا کسی امیر گھرانے میں پیدا ہونا ہی انسان کی ترقی کا واحد ذریعہ نہیں ہے۔ اس طرح کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ ایک شخص مادی سہولتوں کے نہ ہونے کے باوجود اعلیٰ مدارج پر پہنچ گیا۔ اور دوسرا شخص تمام آسانیوں کے ہوتے ہوئے کوئی ترقی نہ کرسکا۔ اور زوال کا شکار ہوگیا۔ آدمی کی ترقی اور تنزلی یا بننے اور بگڑنے کا واحد سبب ماں باپ سے ملنے والا ورثہ ہی نہیں ہے بلکہ اس ورثہ سے زیادہ دوسرے عوامل اس میں کام کرتے ہیں۔

(۵)۔ وراثت قدرت کا ایک لچک دار قانون ہے۔ آدمی اپنے عزم و حوصلہ جدوجہد، محنت اور ماحول کے تعاون سے جس طرح اپنی کمزوریوں کو دور کرسکتا اور

فطری صلاحیتوں کو جلا دے سکتا ہے۔ اسی طرح اپنی خراب معاشی حالت کو بھی بدل سکتا ہے اور اپنی غفلت اور کوتاہی اور ماحول کے عدم تعاون سے جس طرح اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اسی طرح اپنی بہترین معاشی حالت کو بھی بگاڑ سکتا ہے۔ یہ دراصل ریاست اور پورے معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ وہ انسان کو صحیح رُخ پر لگائے۔ اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کو اُبھرنے کا موقع فراہم کرے اور ایسے حالات پیدا کرے کہ وہ آسانی سے ترقی کر سکے۔

اِن اسباب کی بنیاد پر اسلام آدمی کے مال و دولت کا اس کے اہل خاندان کو جائز وارث تصور کرتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ ہر شخص کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی تمام سہولتیں اور آسانیاں بھی فراہم کرتا ہے۔ ایک اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ داری قبول کرتی ہے کہ وہ انسان کے بنیادی حقوق کی حفاظت کرے گی۔ اور کسی بھی شخص کو اس حال میں نہیں چھوڑے گی کہ وہ کارخانہ اور جائیداد کا وارث نہ ہونے کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکے اور ترقی کی راہیں اس پر بند ہو جائیں۔

اسلام کے آنے سے پہلے عرب میں وراثت کا رواج تھا اور اس پر عمل بھی ہو رہا تھا لیکن اس میں بڑی ناانصافیاں اور بے اعتدالیاں پائی جاتی تھیں۔ اسلام نے اِن سب کی اصلاح کی اور اس کو ایسی معتدل اور مبنی بر انصاف شکل عطا کی کہ وہ ہر دور میں اور ہر سوسائٹی کے لئے موزوں ترین قانون بن گیا۔ اور اس میں ابدیت کی شان پیدا ہو گئی۔ اس قانون کو پوری طرح سمجھنے کے لئے پہلے عرب جاہلیت کے تصورِ وراثت کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس سے صحیح اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام نے اس میں کیا اصلاحات کیں۔ اس کے عدمِ توازن کو کس طرح توازن سے بدلا اور وقتی اثرات سے اس کو کیسے آزاد کر کے قیامت تک کے لئے ناقابل ترمیم و تنسیخ بنا دیا۔

دورِ جاہلیت میں وراثت کی حسب ذیل بنیادیں تھیں[1]

۱۔ حسب و نسب : انسان کے نسبی رشتہ دار اس کے وارث ہوتے تھے۔ لیکن نابالغ

---

[1] اس موضوع پر امام ابو بکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔ احکام القرآن ۲/۹۰-۹۳ ہم نے مزید

باقی حاشیہ صفحہ ۹۳ پر

بچوں اور عورتوں کا وراثت میں کوئی حق نہیں تھا۔ چاہے وہ قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ وراثت میں عمر کا خیال رکھا جاتا۔ جو سب سے بڑا ہوتا وہ سب سے زیادہ وراثت کا مستحق ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔

لا یعطون المیراث الا من قاتل ویعطونه الاکبر فالاکبر[۱]	وہ صرف لڑنے والوں کو میراث دیتے۔ وہ سب سے بڑے کو میراث دیتے اس کے بعد اس سے چھوٹے کا حق ہوتا۔

ابنِ زید کہتے ہیں۔

کان النساء لا یرثن فی الجاھلیة من الاباء وکان الکبیر یرث ولا یرث الصغیر[۲]	جاہلیت میں باپ کے مال میں عورت وارث نہیں ہوتی تھی۔ بڑا بچہ وارث ہوتا اور چھوٹا وارث نہیں ہوتا تھا۔

۲۔ دوسری بنیاد تھی تبنیت: اس کا مطلب ہے کسی دوسرے شخص کے بچہ کو اپنا بچہ بنا لینا۔ عرب کے رواج کے مطابق یہ بہت بڑا اقدام تھا اس لئے کہ جس بچہ کو اپنایا جاتا (متبنّٰی) اس کو حقیقی اولاد کے حقوق حاصل ہو جاتے۔ وہ اسی شخص کی طرف منسوب ہوتا جس نے اُسے اپنا بچہ بنایا ہے۔ اور اس کے مال و جائیداد کا بھی وہ وارث ہوتا۔ اسی طرح متبنّٰی کا انتقال ہو جاتا تو اس کا حقیقی باپ اس کا وارث نہ ہوتا۔ بلکہ یہ مجازی باپ وارث ہوتا حضرت عائشہؓ دورِ جاہلیت کی اس رسم کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتی ہیں۔

بقیہ حاشیہ صـ۹۲:۔

تفصیلات اور ضروری باتوں کے حوالے دوسرے مآخذ سے بھی فراہم کر دیئے ہیں۔

حاشیہ صفحہ ہٰذا :۔

[۱]۔ ابن جریر: تفسیر جزو ۴ / ۱۷۱۔ یہی روایت ابن کثیر نے ابن ابی حاتم سے بھی نقل کی ہے۔ تفسیر ۱ / ۴۵۸

[۲]۔ ابن جریر: تفسیر ۴ / ۱۶۳

وکان من تبنّٰی رجلاً فی الجاھلیۃ دعاہ الناس الیہ وورث میراثہ[۱]

جاہلیت میں جو شخص کسی کو اپنا متبنیٰ بنا لیتا لوگ اُسے اسی کی طرف منسوب کرتے اور وہ اس کی میراث کا وارث ہوتا۔

اسلام سے پہلے ہی کا یہ واقعہ ہے کہ رسول اللہ۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ نے حضرت زید بن حارثہ رضؓ کو اپنا متبنیٰ بنایا تو کعبہ میں حجر اسود کے پاس انھیں لے گئے۔ اور وہاں جو لوگ موجود تھے ان کے درمیان اعلان فرمایا

اشھدوا ان زیداً ابنی یرثنی وارثہ

گواہ رہو کہ زید میرا بیٹا ہے۔ وہ میرا وارث ہوگا اور میں اس کا وارث ہوں گا۔

چنانچہ اس کے بعد زید ابن حارثہ۔ رضی اللہ عنہ۔ کو زید بن محمد ۔صلی اللہ علیہ وسلم۔ کہا جانے لگا۔[۲]
اسی طرح اسود بن عبد یغوث نے مقداد بن عمرو۔ رضی اللہ عنہما۔ کو اپنا متبنیٰ بنایا تو وہ مقداد بن اسود بن گئے۔[۳]

تیسری بنیاد تھی "معاہدہ" اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ دو اجنبی اشخاص جن کے درمیان کوئی خونی رشتہ نہیں ہوتا تھا۔ باہم ایک معاہدہ کے ذریعے کچھ باتوں کے پابند ہو جاتے تھے۔ اس میں یہ بات بھی شامل ہوتی تھی کہ وہ ایک دوسرے کی وراثت میں بھی حقدار ہوں گے۔ اس معاہدہ کا سوسائٹی میں اعلان ہو جاتا اور جس کا بھی انتقال ہوتا اس کے خاندان کے لوگ اس معاہدہ کا احترام کرتے۔ معاہدہ اسی قسم کا ہوتا تھا۔

دمی دمک وھدمی ھدمک وترثنی وارثک وتطلب بی واطلب بک[۴]

میرا خون تمہارا خون ہوگا۔ میری قبر وہیں ہوگی جہاں تمہاری قبر ہوگی۔ تم میرے وارث ہوگے اور میں تمہارا وارث ہوں گا۔ تم میرے خون (دیت) کا مطالبہ کروگے اور مجھے تمہارے خون (دیت) کے مطالبہ کا حق ہوگا۔

---

[۱] بخاری کتاب النکاح، باب الاکفاء فی الدین۔ ابوداؤد، کتاب النکاح، باب من حرم بہ [۲] ابن عبد البر: الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب۔ تذکرہ زید بن حارثہ [۳] حوالہ سابق۔ [۴] باقی حاشیہ ص ۹۵ پر ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جاہلیت میں اس طرح کے معاہدہ کی بنیاد پر آدمی چھٹے حصہ (۱/۶) کا حقدار ہوتا تھا[۱]۔

چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص (آزاد کردہ غلام) سے اس طرح کا معاہدہ کیا تو اس کے انتقال کے بعد اس کی وراثت میں آپ کو حصہ ملا[۲]

اسلام نے اپنی دعوت کے شروع میں عرب کے رسوم ورواج سے بالعموم تعرض نہیں کیا اور اپنی ساری قوت بگڑے ہوئے عقائد کو ٹھیک کرنے اور دین کی بنیادوں کو مستحکم کرنے میں صرف کیا۔ چنانچہ اسلام کے آنے کے بعد وراثت کے معاملہ میں بھی ایک عرصہ تک عرب کے طریقوں ہی پر عمل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ہجرت کا مرحلہ پیش آیا۔ اور وہ لوگ جو اسلام قبول کرنے کی وجہ سے طرح طرح کے ظلم وستم برداشت کر رہے تھے۔ اپنے خویش واقارب اور وطن کو چھوڑ کر مدینہ پہنچنے لگے۔ اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ان مہاجرین کی آبادکاری کا تھا۔ اس کا حل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نکالا کہ مدینہ کی مسلم آبادی اور مہاجرین کے درمیان "مواخات" قائم کردی۔ اور وہ ایک دوسرے کے بھائی بنا دئے گئے۔ یہ مواخات بڑے دوررس نتائج کی حامل تھی۔ اس کے نتیجہ میں وہ ایک دوسرے کے وارث بھی قرار پائے۔

محمد بن زید کہتے ہیں۔

کان النبی قد اخی بین المھاجرین والانصار | نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے شروع میں

(حاشیہ صفحہ ۹) [۱] جصاص ۲/۹۱، مختلف راویوں نے معاہدہ کے جو الفاظ نقل کئے ہیں ان میں تھوڑی سی کمی بیشی پائی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں خاص الفاظ کی پابندی نہیں کی جاتی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ معاہدہ کے شرائط بدلتے رہتے ہوں لیکن حق وراثت غالباً معاہدہ میں ضرور شامل ہوتا۔ اس لئے کہ جو الفاظ نقل کئے گئے ہیں ان میں اس کا ذکر ہر جگہ موجود ہے۔ ملاحظہ ہو، ابن جریر ۵/۳۲ حاشیہ صفحہ ۹۵ [۱]۔ علی المتقی الہندی، کنز العمال ۱۱/۸۲۔ [۲]۔ حوالہ سابق۔ ابن جریر ۵/۳۲، ۵۳۔ جصاص، احکام القرآن ۲/۹۱

اولی ما کانت الھجرۃ وکانوا اعلیٰ ذلک[۱]
مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کرادی تھی اور وہ اس بنیاد پر ایک دوسرے کے وارث ہوئے تھے۔

یہ پس منظر تھا جس میں اسلام کا قانونِ وراثت نازل ہوا۔ اس نے یکلخت جاہلیت کے تمام طریقوں کو منسوخ نہیں کیا بلکہ بتدریج ان میں اصلاح کی اور وراثت کے جو غلط اور غیر فطری طریقے تھے۔ ان کو ختم کر کے صحیح اور بالکل فطری ضابطے وضع کئے۔

جاہلیت میں عورتوں اور چھوٹے بچوں کو اس لئے وراثت سے محروم رکھا جاتا تھا کہ وہ کمزور اور دوسروں کے محتاج ہوتے ہیں۔ ان کی منطق یہ تھی کہ وراثت کا حقدار وہی شخص ہو سکتا ہے جو دشمن کا مقابلہ کر سکے اور جنگ میں اس سے مالِ غنیمت چھین سکے۔ عورتوں اور بچوں کیلئے اپنی مدافعت بھی مشکل ہے۔ اور دوسروں کو ان کی حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے وہ وراثت کے حقدار نہیں ہوتے تھے۔ ابن جریر جاہلیت کے اس دستور کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

ان اھل الجاھلیۃ کانوا لا یقسمون میراث المیت لاحد من ورثتہ بعدہ ممن کان لا یلاقی العدو ولا یقاتل فی الحروب من صغار ولدہ ولا النساء منھم وکانوا یخصون بذلک المقاتلۃ دون الذریۃ[۲]

اہل جاہلیت مرنے والے کے وارثوں میں سے بچوں کو جو دشمن کا سامنا نہیں کرتے اور جنگ میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ اور عورتوں کو اس کی میراث میں سے حصہ نہیں دیتے تھے بلکہ خاص طور پر لڑنے والوں کو میراث دیا کرتے تھے بچوں کو اس سے محروم رکھتے تھے۔

اسلام کے آنے کے بعد بھی ایک عرصہ تک عورت وراثت سے محروم رہی۔ اور بعض اوقات اس حکم کے خلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت بھی کی گئی۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ سعد بن ربیع جنگِ احد میں شہید ہو گئے۔ تو انھوں نے جو مال چھوڑا تھا اسے اُن کے بھائی نے لے لیا۔ (اس لئے کہ ان کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی) حضرت سعد بن ربیع کی بیوی ان کی دو بچیوں کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ اور عرض کیا حضورؐ! آپ کو معلوم ہے کہ سعد شہید ہو گئے۔ یہ اُن کی

---

[۱] طبری: تفسیر ۲۱/ ۷۲ [۲] طبری: تفسیر ۴/ ۱۷۱

بچیاں ہیں ۔ انھوں نے جو کچھ مال چھوڑا تھا ۔ اس پر ان کے چچا نے قبضہ کر لیا ۔ ان کی شادی کے لئے پیسہ چاہیئے ۔ اس کے بغیر شادی نہیں ہو سکتی ۔ (اب بتائیے میں کیا کروں؟) ۔ حدیث میں آتا ہے کہ اس کے بعد احکامِ میراث نازل ہوئے اور لڑکیوں کا حصہ متعین ہوا[1] ۔

اسی طرح اوس بن ثابت رضؓ کا انتقال ہوا تو ان کے پس ماندگان میں ان کی بیوی، ایک کم سن لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں ۔ ان کی وراثت پر ان کے بھتیجوں نے قبضہ کر لیا ۔ اور ان کے بیوی بچوں کو اس میں کوئی حصہ نہیں ملا ۔ اوس ابن ثابت رضؓ کی بیوی نے ان کے بھتیجوں سے درخواست کی کہ وہ کم از کم ان لڑکیوں سے شادی کر لیں ۔ لیکن چونکہ وہ خوبصورت نہیں تھیں اس لئے یہ دونوں اس کے لئے آمادہ نہیں ہوئے ۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو عرب کے دستور کے مطابق ان دونوں نے جواب دیا کہ یہ لوگ میراث کے حقدار کیسے ہو سکتے ہیں ۔ جو نہ تو گھوڑے پر سوار ہو سکتے ہیں نہ دشمن کا مقابلہ کر سکتے اور نہ کسی کا معاشی بوجھ اٹھا سکتے ہیں ۔ اس کے بعد قرآن مجید کی آیت نازل ہوئی کہ آدمی کے مال میں مردوں اور عورتوں دونوں کا حصہ ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ جب تک تفصیلی احکام نہ آجائیں ۔ وہ میراث میں سے کوئی چیز نہ لیں[2] ۔

زمانۂ جاہلیت کا یہ طریقہ سراسر ظلم اور زیادتی پر مبنی تھا ۔ یہ بات انسان کی عقل اور

---

[1] ۔ ترمذی : ابواب الفرائض ، باب ما جاء فی میراث البنات ، ابوداؤد ، کتاب الفرائض ، باب ما جاء فی میراث الصلب ۔ ابوداؤد کی ایک روایت میں سعد بن ربیع کی لڑکیوں کو ثابت بن قیس کی لڑکیاں کہا گیا ہے ۔ لیکن جیسا کہ خود امام ابوداؤد نے کہا ہے کہ یہ ایک راوی حدیث بشر بن مفضل کی چوک ہے اس لئے کہ جنگ احد میں حضرت سعد بن ربیع شہید ہوئے تھے ۔ اور ثابت بن قیس کی شہادت جنگ یمامہ میں ہوئی تھی ۔

[2] ۔ اس واقعہ کی ایک تو تفصیلات میں بھی تھوڑا سا اختلاف ہے ۔ (ملاحظہ ہو ۔ بغوی : معالم التنزیل تفسیر سورۂ نساء آیت روح المعانی ۴/۲۱۰) دوسرے اس میں بھی اختلاف ہے کہ وہ کون شخص تھا جس (باقی حاشیہ صفحہ ۹۸ پر)

اس کی فطرت کے بالکل خلاف ہے کہ وراثت کے حقدار صرف مرد ہوں اور عورتیں نہ ہوں۔ لڑکے وراثت میں حصہ پائیں اور لڑکیوں کو حصہ نہ ملے، کم زور محروم رہیں ۔اور طاقت ور دوسرے کا بھی حق مار کھائیں ۔ حالانکہ عقل کا صریح تقاضا یہ ہے کہ جو کمزور ہو اس کو ہمدردی اور تعاون کا زیادہ مستحق سمجھا جائے ۔ اس کے حق کی زیادہ حفاظت کی جائے ۔ اور اس کے ساتھ ظلم و زیادتی کو کسی حال میں روا نہ رکھا جائے ۔ حیرت ہوتی ہے کہ ماں باپ اپنی اولاد کے ساتھ اور خاندان کے سربراہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ اتنے بڑے ظلم کا ارتکاب کر رہے تھے اور اس کے خلاف کوئی ردِّ عمل تو در کنار کوئی نفرت کا جذبہ بھی نہیں پایا جاتا تھا[1]۔

اہلِ عرب کے نزدیک عورتوں اور بچوں کا وارث نہ ہونا اس قدر مسلم تھا کہ قرآن مجید میں

(بقیہ حاشیہ صـ۹۷)

کی وراثت زیرِ بحث تھی ۔ اسی طرح کسی روایت میں کہا گیا ہے کہ مرنے والے کی دو لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا ۔کسی روایت میں تین لڑکیوں کا ذکر ہے ۔ ابنِ جریر کی ایک روایت میں پانچ لڑکیاں بتائی گئی ہیں ۔ (۴/ ۱۷۱)۔ابن جریر کی ایک اور روایت میں شکایت کرنے والی خاتون کا نام "ام کجلہ" کہا گیا ہے ۔جس کی صرف ایک لڑکی تھی ۔ان کے شوہر ثعلبہ کے انتقال کے بعد ان کے بھائی یعنی لڑکی کے چچا نے وراثت پر قبضہ کر لیا تھا ۔ (۴/۱۶۳) مرنے والے کے بھتیجوں کے نام کسی روایت میں قتادہ، وعرفطہ اور کسی میں سوید وعرفطہ بتائے گئے ہیں ۔تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ۔ ابن حجر: الاصابہ فی تمییز الصحابہ ، تذکرہ اوس بن ثابت ۱/۸۰ ۔نیز تذکرہ ام کجلہ ۴/۴۸۷، ۴۸۸

حاشیہ صفحہ ہذا :

[1] دورِ جاہلیت کے ایک شخص عامر بن جشم کے بارے میں آتا ہے کہ اس نے اپنی لڑکی کو نہ صرف یہ کہ وراثت میں حصہ دیا بلکہ لڑکے اور لڑکی کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ۔ اور مساوات برتی ۔ (ابن حجر: فتح الباری ۱۲/ ۱۱) یہ واقعہ ہو یا اس نوعیت کا کوئی اور واقعہ ان کی حیثیت شاذ و نادر واقعات کی تھی ۔ یہ کوئی عمومی ردِّ عمل نہیں تھا ۔

جب میراث کے احکام نازل ہوئے اور مردوں کے ساتھ عورتوں اور بچوں کے بھی حقوق بیان ہوئے تو بہت سے لوگوں کو تعجب ہوا کہ بیوی اور لڑکی بھی وارث ہو گی۔ اور چھوٹا بچہ بھی بڑے آدمی کی طرح وراثت میں حصہ دار ہوگا۔ حالانکہ ان میں سے کسی میں بھی دشمن کے مقابلے اور مالِ غنیمت حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں[1]۔

قرآنِ مجید نے احکام میراث بیان کرنے اور قرابت داروں کے حقوق متعین کرنے سے پہلے ایک اصولی اعلان کیا۔ یہ اعلان بہت اہم تھا۔ اس نے دورِ جاہلیت کے بہت سے ضابطوں کو ختم کر کے رکھ دیا۔ اس نے کہا :۔

للرجال نصیب مما ترک الوالدان و الاقربون، وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل منه او کثر (النساء)	مردوں کا بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے اور عورتوں کا بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہے چاہے وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔

یہاں قرآن مجید نے عورتوں کے حق وراثت کا اتنے ہی اہتمام سے ذکر کیا ہے جتنے اہتمام سے مردوں کے حق کا ذکر کیا ہے۔ خاص بات دیکھنے کی یہ ہے کہ اس نے یہ نہیں کہا کہ والدین اور قرابت داروں کے مال میں مردوں اور عورتوں کا حق ہے بلکہ مردوں کے حق کو الگ سے بیان کیا اور عورتوں کے حق کا جداگانہ ذکر کیا تاکہ دونوں کی انفرادیت باقی رہے۔ اور یہ معلوم ہو کہ مرنے والے کے مال میں جس طرح مردوں کا مستقل حق ہے اسی طرح عورتوں کا بھی مستقل حق ہے۔ ان میں سے کسی کا حق بھی کسی دوسرے کے حق کے تابع نہیں ہے۔ جو چیز جاہلی معاشرہ کا جزء بن چکی تھی اس کو ختم کرنے کے لئے دونوں کے حقوق کو دو مستقل دفعات میں بیان کرنا ضروری تھا۔

اس کے ساتھ اس نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی کہ مال تھوڑا ہو یا بہت

---

[1] ابن جریر : تفسیر ۴/ ۱۷۱

کم قیمت ہو یا بیش قیمت اس میں دونوں کا حصہ ہوگا ۔ ایسا نہیں ہوگا کہ جائیداد، مکان، کارخانہ، قیمتی سازوسامان اور روپیہ پیسہ مرد کا ہو ۔ اور کچھ بے قیمت چیزیں عورت کا حق سمجھی جائیں ۔ بلکہ جو بھی مال ہے اور جس نوعیت کا بھی ہے ۔ اس میں دونوں کا حق ہوگا ۔ اور خدا کی ہدایت کے مطابق وہ ان کے درمیان تقسیم ہوگا ۔ آخر میں فرمایا کہ عورت اور مرد کے حقوق خدا کی طرف سے متعین کر دئے گئے ہیں ۔ جو بہرحال ان کو ملنے چاہئیں ۔ ان میں سے کوئی فرد کسی کو نہ تو محروم کر سکتا ہے اور نہ اس کے حق پر قبضہ کر سکتا ہے ۔

اس کے بعد قرآن مجید نے مردوں، عورتوں، لڑکوں اور لڑکیوں سب ہی کے حقوقِ وراثت تفصیل سے بیان کئے ہیں ۔ اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوا ہے ۔

یوصیکم اللہ فی اولادکم ...... اللہ تعالیٰ تم کو تمہاری اولاد کے معاملہ میں وصیت کرتا ہے

اللہ تعالیٰ جب کسی کام کی وصیت کرتا ہے تو اس کے معنی یہی نہیں ہوتے کہ وہ اس کی انجام دہی کی نصیحت کرتا ہے بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ اس کام کا حکم دے رہا ہے اس کی بزور تاکید کر رہا ہے ۔ اور اسکو پورا کرنے کا بندہ سے عہد و پیمان لے رہا ہے[1] ۔

'اولاد' کے لفظ میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہیں ۔ چاہے وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، امیر ہوں یا غریب، عالم ہوں یا جاہل، اس لئے کہ اولاد بہرحال اولاد ہے اور والدین سے یکساں تعلق رکھتی ہے ۔ ان میں تفریق صحیح نہیں ہے ۔ ابن جریر طبری

---

[1] ۔ 'وصیت' کے معنی امام راغب اصفہانی نے ان الفاظ میں بیان کئے ہیں ۔ ان یتقدم الی الغیر مایعمل فیہ مقترنا بوعظ (مفردات القرآن) یعنی نصیحت کے انداز میں کسی کو ایسی بات بتانا جس پر وہ عمل کرے ۔ مجدالدین فیروز آبادی کہتے ہیں ۔ اوصاہ ووصاہ توصیۃ، عھد الیہ ...... ویوصیکم اللہ ای یفرض علیکم (قاموس مادہ وصی) 'اوصاہ' اور 'وصاہ' کے معنی یہ ہیں کہ اس نے اس سے عہد لیا اور اس کو اس کا پابند بنایا ۔ 'یوصیکم اللہ' کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر فرض کرتا ہے ۔

کہتے ہیں۔

سواءٌ فیہ صغار ولدہ وکبارہ واناثھم[1]

اس حکم میں مرنے والے کے بچے چھوٹے ہوں یا بڑے یا وہ لڑکیاں ہوں۔ سب برابر ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے اور اس کی پابندی کی تاکید کرتا ہے کہ تم اپنی اولاد کے درمیان کسی قسم کا فرق نہ کرو۔ اور ان میں سے ہر ایک کو اس کا حق ادا کرو۔ اولاد کے بارے میں والدین کو وصیّت کر کے اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ انسان اپنے بچوں کے ساتھ بھی زیادتی کر سکتا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ اس نے زیادتی کی بھی ہے۔ لیکن خدائے تعالیٰ کی ذات عدل وانصاف کا سرچشمہ ہے وہ انسان پر اس سے زیادہ مہربان ہے جتنا ماں باپ اپنے بچہ پر ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ اس لئے اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ ماں باپ کو بھی اپنی اولاد کے ساتھ عدل و انصاف کا حکم دے اور ان کو ناانصافی سے منع کرے۔ یہی بات مشہور سیرت نگار سہیلی نے ان الفاظ میں کہی ہے۔

اضاف الاولاد الیھم مع انہ الذی اوصٰی بھم اشارۃً الی انہ ارحم بھم من آبائھم[2]

اللہ تعالیٰ نے اولاد کو ان کے (آباء) کی طرف منسوب کیا، لیکن اس کے ساتھ اس نے ان کے بارے میں انصاف کی ان کو وصیت کی۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ وہ ان کے آبار سے زیادہ ان پر مہربان ہے۔

(باقی)

---

[1] - طبری: تفسیر ۴/۱۷۱

[2] - ابن حجر: فتح الباری ۱۱/۲